علامہ نیاز فتح پوری اور مسلم نشاۃِ ثانیہ

مسلم شمیم

پندرھویں صدی میں یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کے ظہور نے یورپ کے معاشرے کو جہت تغیرات اور انقلابات سے دوچار کیا اور یورپ میں عہدِ جدید کی بنیادیں استوار کیں۔ انقلاب فرانس صنعتی انقلاب، روشن خیالی کی تحریک اور ریاست سے مذہب کی علیحدگی، یہ سب کچھ مذکورہ نشاۃِ ثانیہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آج کی دنیا سائنسی اور تکنیکی ایجادات اور دریافتوں کے نتیجے میں گلوبل ولیج (GLOBAL VILLAGE) میں تبدیل ہوگئی ہے، نشاۃِ ثانیہ اس کا نقطۂ آغاز اور سرچشمہ تھا مشرق میں عمومی اور مسلم دنیا میں خصوصی طور پر اس باب میں کچھ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ مسلم معاشرے میں جو تحریکیں بھی ابھریں، وہ احیائی تحریکیں تھیں۔ انیسویں صدی میں سرسید احمد خاں کی تحریک کی کثیر الجہتی کو ہم نشاۃِ ثانیہ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ سائنس کی ترویج کے لیے ۱۸۶۳ء میں سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی اور سائنسی جرنل کے اجرا کو میرے نزدیک کلیدی اہمیت حاصل ہے شعبۂ تعلیم میں علی گڑھ میں کالج کا قیام بھی ایک جامع تحریک تھی جسے علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔ فکر و شعور کے محاذ پر سرسید کو دیوبند مدرسے کے علما اور دیگر مذہبی حلقوں کی جہاں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور کفر والحاد کے فتووں کے ذریعے اُن پر تیر برسائے گئے اور نیچری کا لقب دیا گیا، وہاں انھیں ایک حلقہ دانش کی حمایت اور عملی تعاون بھی حاصل ہوا جن میں مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا عبدالحلیم شرر اور ڈپٹی نذیر احمد کے علاوہ متعدد اکابر ادب و شعور کے نام شامل ہیں۔ ان میں ایک اہم نام علامہ نیاز فتح پوری کا بھی ہے۔

برصغیر ہند و پاک میں علامہ نیاز فتح پوری اُن چند اہلِ فکر و دانش میں سے تھے جن کی شخصیت قاموسی (ENCYCLOPAEDIC) تھی۔ اُن کی شخصیت کی جامعیت اور کثیر الجہتی کے حوالے سے اُن کو ایک اکیڈمی کہنا درست ہوگا۔ اُن کے GENIUS کا اظہار علم و ادب اور فکر و دانش کے مختلف شعبوں میں یکساں طور پر ہوا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری مخزنِ علوم تھے اور اُن کی شخصیت میں فطرتِ انسانی کی دھنک کے ساتوں رنگ کا ارتکاز تھا۔ وہ شعر و ادب، فلسفہ و مذہب، تاریخ و سیاسیات عمرانیات و نفسیات، جمالیات و جنسیات، تحقیق و تخلیق، غرض ہر شعبے میں ایک نابغۂ اعظم نظر آتے تھے۔ تحقیق و تنقید ہو یا تصنیف و تالیف و ترجمہ، افسانہ نگاری ہو یا مراسلہ نگاری، فلسفہ طرازی ہو یا انشا پردازی، اُن کی انفرادیت اور انچ کی چھاپ اور رجحان سازی کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ صاحب طرز ادیب اور علم و عقل سے پیدا ہونے والے یقین کے بل بوتے پر للکارنے والے دانش ور تھے۔ ہر نوع کی تنگ نظری، توہم پرستی اور عصبیت کے خلاف اُن کی استقامت اور نبرد آزمائی و مبارزت طلبی اور نامساعد حالات میں بھی اُن کی حوصلہ مندی مثالی تھی۔ انھوں نے آزادیِ فکر کو جس خلوص اور صداقت کے ساتھ جرأتِ اظہار بخشی، اس باب میں وہ روسو اور والٹیر کے قبیلے کے رکن رکین نظر آتے تھے۔ وہ جرأتِ انکار کی روایت کے بھی علم برداروں میں سے تھے۔ انکار کی جرأت کی روایت کے حوالے سے سبط حسن کے ایک مضمون کا اقتباس یہاں پیش کرنا بے محل نہیں:

> ''اقرار پسند معاشرے کا اسمِ اعظم ایک چھوٹا سا سہ حرفی لفظ 'ہاں' ہے۔ اس لفظ میں علی بابا کے کھل جا سم سم سے بھی کہیں زیادہ تاثیر پوشیدہ ہے۔ جن لوگوں کو 'ہاں' کہنے کا ہنر آتا ہے اُن پر دنیا و عاقبت کی نعمتوں کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں، اقتدار اُن کو پہلو میں بٹھاتا ہے، اختیار اُن کے قدم چومتا ہے، مال و عمائدین اُن کی دوستی پر فخر کرتے ہیں، علمائے دین اُن کے بازو پر امام ضامن باندھتے ہیں، اُن کا سنگین سے سنگین جرم بھی قانون کی پرسش سے بَری ہوتا ہے اور اُن کی ہر بدی کو نیکی سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن ہر اقرار پسند معاشرے میں ایسے دیوانے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے برائی کو بھلائی کہنے سے ہمیشہ انکار کیا اور سزا پائی۔ سقراط نے نہیں کہا اور اسی جرم کی پاداش میں اُس کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، مسیح نے نہیں کہا اور مصلوب ہوئے، ابوذر غفاری نے نہیں کہا اور صحرائے نجد میں تڑپ تڑپ کر جان دی، امام حسینؓ نے نہیں کہا اور شہید ہوئے، امام ابو حنیفہ نے نہیں کہا اور بارہ سال قید رہ کر قید خانے ہی میں وفات پائی، برونو اور جان ہوس نے نہیں کہا اور آگ میں جلائے گئے، تھامس مور نے نہیں کہا اور قتل ہوا، سرمد نے نہیں کہا اور سر قلم کروایا، حسن و وفا کی پیکر طاہرہ قرۃ العین نے نہیں کہا اور ماری گئی اور پھانسی پائی، جولیس فوچک اور گیبریل پری نے نہیں کہا اور قتل ہوئے، حسن ناصر نے نہیں کہا اور قلعہ لاہور میں اس شان سے قربان ہوئے کہ نہ کہیں جنازہ اٹھا نہ کہیں مزار بنا، چلی کے صدر اللندے نے نہیں کہا اور زندگی جمہوری قدروں پر نچھاور کر دی''۔

علامہ نیاز فتح پوری کو اس میں شک نہیں کہ نہ تو دار و رسن کے مرحلے سے گزرنا پڑا اور نہ منصبِ شہادت پر فائز ہوئے مگر کفر و الحاد کے فتووں کی زد میں وہ بارہا آئے اور مرتد ہونے کے جرم میں بارہا حلقۂ شریعت میں واجب

القتل ٹھہرائے گئے۔ علامہ نیاز فتح پوری اور حریتِ فکر کے زیرِ عنوان سبط حسن نے اس زاویہ نظر سے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

"علامہ نیاز فتح پوری کا چھوڑا ہوا علمی، ادبی اور فکری ورثہ کیفیتی و کمیتی ہر دو اعتبار سے نہایت وقیع ہے۔ علامہ کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد ۳۴ بتائی گئی ہے ماہ نامہ 'نگار' کے مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے دس خاص نمبروں کے سارے مضامین انھی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اُن میں صرف ایک خاص نمبر کا نصف حصہ دوسرے حضرات کے مضامین پر مشتمل ہے۔ 'نگار' میں شائع ہونے والی اُن کی تحریروں میں پانچ سو اداریے، سات سو علمی و ادبی مقالات، پانچ سو سوانحی مضامین ڈیڑھ سو فارسی نظمیں اور غزلیں، پندرہ اردو غزلیں، نو اردو نظمیں، ڈھائی سو استفسار کے جوابات اور تین تبصرے شامل ہیں۔ یہ غیر معمولی خزینہ یقیناً کسی قاموسی شخصیت کی دین ہو سکتا ہے"۔

ادب کا ایک قاری ہونے کے علاوہ میں علم سیاسیات کا بھی ایک طالب علم رہا ہوں اور اسی حوالے سے شعبہ تدریس سے میری ایک عرصے تک وابستگی رہی ہے۔ میں نے جس حد تک علامہ کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے، خواہ وہ شعبۂ تنقید و تحقیق ہو یا مذہبیات یا کوئی بھی شعبۂ علم و فن، مجھے اُن میں سب سے نمایاں عنصر فکر و دانش کا نظر آیا اور اس فکر و دانش کی اساس تعقل پسندی (RATIONALISM) پر استوار نظر آئی۔ وہ مجھے از اول تا آخر فکریات کی دنیا کی ایک عظیم شخصیت دکھائی دیے۔ اُن کی سوچ سائنسی تھی۔ اُن کے نزدیک کوئی فکر، کوئی عقیدہ، کوئی کلیہ اور ضابطہ حیات جو انسانوں کے تجربوں، مشاہدوں اور عقل و فہم سے بعید ہے، قابلِ قبول نہیں۔ بقول اُن کے "سائنس ہم کو صرف اُن باتوں کا یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہنچنا چاہتی ہے۔ سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں۔ وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے صرف کا مطالبہ کرتی ہے"۔

میں نے اپنے موضوع کا انتخاب کرتے وقت اُن کی تین تصانیف کو خاص طور پر اپنے پیشِ نظر رکھا ہے، یعنی "مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ"، "نگار" کا 'خدا نمبر' اور "من و یزداں"۔ میں نے ان تصانیف میں ایک قدرِ مشترک بلکہ زاویہ مشترک وہی تعقل پسندی پائی جس کے پیشِ نظر وہ مجھے ایک سیکولر مفکر نظر آئے، کیونکہ اُنھوں نے عقل کو اپنا رہ نما بنایا اور ہمارے روایتی عقائد و افکار اور رسم و رواج کو علومِ جدیدہ کی کسوٹی پر پرکھا۔ اُنھوں نے منقولات پر معقولات کو، روایت پر درایت کو کورانہ تقلید پر اجتہاد کو ترجیح دی اور کورانہ اسلاف پرستی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔

علامہ کی سیکولرازم پر مبنی فکر و دانش پر گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ خود سیکولرازم کے نظریے پر مختصراً اظہارِ خیال کرتا چلوں، کیونکہ ہمارے معاشرے میں بہت سے مغالطوں اور کج فہمیوں کا ہدف بننے والی اصطلاحات اور نظریات میں سیکولرزم سرِفہرست ہے 'سیکولرزم' اصطلاح کی نہ صرف غلط تاویل کی جاتی رہی ہے بلکہ غیر اسلامی بتا کر عوام میں گم راہی پھیلائی گئی ہے۔ 'سیکولرزم' لادینی اور دہریت (ATHEISM) سے عبارت نہیں ہے۔ 'سیکولرزم' ایک سائنٹفک نظریہ ہے جو انسانی سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ انقلاب اور جمہوریت کے تصورات کے ساتھ پروان چڑھا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ لغات میں سیکولرزم کو ایک ایسا معاشرتی نظام کہا ہے جس کی اساس مذہب کے بجائے سائنس پر ہو اور جس میں ریاستی امور کی حد تک مذہب کی مداخلت کی گنجائش نہ ہو۔ سیکولر خیالات بہت قدیم ہیں، لیکن سیکولرزم کی اصطلاح جارج جیکب ہولی اوک (GEORGE J. HOLYOAKE) نامی ایک آزاد خیال انگریز نے ۱۸۴۰ء میں وضع کی۔ وہ شہر برمنگھم کے میلنکس انسٹیٹیوٹ میں استاد تھا جس کو برطانیہ کے مشہور آزاد خیال سوشلسٹ رابرٹ اوون (ROBERT OWEN, 1771 TO 1857) کا ہم نوا ہونے کے جرم میں برطرف کر دیا گیا تھا اور وہ کُل وقتی مبلغ بن گیا تھا۔ اُن دنوں لندن سے آزاد خیالوں کا ایک رسالہ 'ندائے عقل' نکلتا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں جب رسالے کے اڈیٹر کو دینِ مسیحی کی بے حرمتی کے جرم میں ایک سال قید اور سو پونڈ جرمانے کی سزا ہوگئی تو ہولی اوک کو اس رسالے کا اڈیٹر مقرر کر دیا گیا، لیکن ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ہولی اوک کو بھی ایک تقریر کی پاداش میں چھ ماہ کی قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ جیل سے نکلنے کے بعد وہ آزاد خیالی کے حق میں مسلسل تقریر کرتا اور رسالے لکھتا رہا۔ ۱۸۵۱ء میں اُس نے لندن میں 'سنٹرل سیکولر سوسائٹی' کے نام ایک انجمن قائم کی۔ ہولی اوک کا موقف یہ تھا کہ انسان کی سچی رہ نما 'سائنس' ہے۔ 'اخلاق' مذہب سے جدا اور پرانی حقیقت ہے، علم و ادراک کی واحد کسوٹی اور سند 'عقل' ہے۔ ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ملنی چاہیے اور ہم کو اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ غرض یہ کہ سیکولرزم کی بنیاد اس کلیے پر قائم ہے کہ ضمیر و فکر اور رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے، لہٰذا ہر فرد کو اس کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل پر خواہ اُن کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب و اخلاق سے، فلسفہ و حکمت سے ہو یا ادب و فن سے، اپنے خیالات کی بلا خوف و خطر ترویج کرے۔

سبط حسن جن کی مارکسی فکریات اور سیکولرزم کے حوالے سے متعدد گراں قدر تصانیف اور تحریریں ہیں، اُن کی رائے ہے کہ "سیکولرزم کو معاشرتی نظام کے لیے درست سمجھنے سے دین دار بے دین اور خدا پرست دہریہ نہیں ہو جاتا، لہٰذا سیکولرزم سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اور

نہ اس سے پاکستان کی بقا و سالمیت پر ضرب پڑتی ہے، بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ سیکولر اصولوں ہی پر چل کر پاکستان ایک روشن خیال، ترقی یافتہ اور خوش حال ملک بن سکتا ہے"۔

جناب سبطِ حسن کی رائے کی تائید میں یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مولانا حسرت موہانی اور مولانا آزاد سبحانی دو ایسی ہستیاں تھیں جن کے ایمان اور دین داری کے سلسلے میں دو آرا نہیں ہیں وہ صرف یہی نہیں کہ سیکولر فکر کے داعی تھے بلکہ دونوں اشتراکیت کے حامی تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی ترقی پسند تحریک کی پُر جوش سرپرستی سے قطع نظر وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانیوں میں سے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی نے آزادی کے بعد اپنی زندگی کا بقیہ عرصہ اس مشن کے حصول میں گزارا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بحیثیتِ مجموعی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو جائیں، کیونکہ اُن کے نزدیک سیکولر ہندوستان ہی میں مسلمانوں کے حال و مستقبل کی ضمانت ممکن تھی، اور اُن کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں میں حقیقی سیکولر جماعت کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ہے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے سیکولر کردار سے غیر مطمئن تھے۔ مولانا آزاد سبحانی اپنے مذکورہ مشن کے سلسلے میں ہمہ وقت ہندوستان کے مختلف خطوں اور شہروں کا دورہ کرتے رہتے اور پٹنہ بھی اُن شہروں میں شامل تھا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں وہ متعدد بار پٹنہ آئے تھے اور مجھے اُن کی صحبت سے فیض یابی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا آزاد سبحانی اور مولانا حسرت موہانی کے علاوہ ہندوستان کے علما کی بھاری اکثریت انڈین نیشنل کانگرس کی سیکولر سیاست کی فکری تائید اور عملی حمایت کرتی رہی تھی اُن میں مولانا محمد حسین مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔ پاکستان کے بانی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر جو انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے کی تھی، وہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کے سلسلے میں اُن کا بیانگِ دہل اعلان تھا اُن کا یہ فقرہ سیکولرزم اور سیکولر ریاست کی مختصر ترین اور جامع تعریف کا حامل ہے:

"RELIGION HAS NOTHING TO DO WITH THE STATE OF THE BUSINESS."

اس ضمن میں قرآن مجید کی دو آیات بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں، یعنی "لا اکراہ فی الدین" اور "لکم دینکم ولی دین"۔ لہٰذا سیکولرزم کو دہریت کا ہم معنی قرار دینا قطعی نادرست ہے اور قائدِ اعظم کو ایک سیکولر جمہوریت پسند رہنما اور مدبر کہنا اُن کے ایک اچھے مسلمان ہونے سے نہ تو انکار کرنا ہے اور نہ اس میں کوئی تضاد کا عنصر شامل ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری کی فکری زندگی کو میں نے اسی زاویے سے دیکھا ہے اور اُن کے افکار و نظریات کا مطالعہ اور تجزیہ بھی اسی نقطۂ نگاہ سے کیا ہے۔

روشن خیالی، خرد افروزی اور تعقل پسندی علامہ نیاز فتح پوری کے نظامِ فکر کا جزو لاینفک بلکہ اُن کے خمیر میں شامل تھی۔ اس ضمن میں جناب خلیق ابراہیم خلیق نے اپنی تصنیف 'منزلیں گرد کے مانند' میں علامہ کے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا جس سے اُن کے فطری میلان اور رجحان کی نشان دہی ہوتی ہے:

"علامہ نیاز فتح پوری کا بچپن ہے اور وہ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور ہسوا میں مولانا محمد حسین خاں کوثی فاضل دیو بند کے درسِ مشکوٰۃ شریف میں شریک ہیں۔ مولانا ایک حدیث پڑھاتے ہیں جس میں کسی نے رسول اللہؐ سے پوچھا، 'دنیا میں سردی اور گرمی کیوں ہوتی ہے؟' آپؐ نے فرمایا، 'آسمان میں ایک بڑا اژدہا ہے جب وہ اپنی سانس دنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو گرمی ہو جاتی ہے اور جب سانس کھینچتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے'۔ نیاز بول اٹھتے ہیں، 'رسول اللہؐ کبھی ایسی خلافِ عقل لغو بات نہیں کہہ سکتے'۔ مولانا کوئی اپنا ڈنڈا اٹھاتے ہیں اور نیاز بھاگ کھڑے ہوتے ہیں"۔

خلیق صاحب نے مزید تحریر کیا:

"روشن خیالی اور خرد افروزی کو مولانا عبدالحلیم شرر جس منزل تک پہنچا چکے تھے، وہاں سے اسے آگے لے جانے کا کام علامہ نیاز فتح پوری نے سرانجام دیا یہ حسنِ اتفاق بھی خوب تھا کہ ۱۹۲۶ء میں شرر کا انتقال ہوا۔ اسی سال 'نگار' لکھنؤ کے مطبع میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۹۲۷ء کے شروع میں نیاز مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے اُس وقت سے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ اجرا تک وہ آزاد خیالی اور عقل پروری کے سب سے بڑے علم بردار رہے اور اُس کے بعد بھی اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک انھیں ترقی پسندوں اور روشن خیالوں کے ایک بزرگ رہنما کی حیثیت حاصل رہی"۔

اس میں کلام نہیں کہ علامہ نیاز فتح پوری کی ترقی پسند تحریک سے کبھی کوئی تنظیمی وابستگی نہ تھی مگر علامہ کی فکر ترقی پسند تحریک کے آدرش سے مکمل ہم آہنگ تھی۔ میرے نزدیک ۱۹۲۲ء میں ماہ نامۂ 'نگار' کے اجرا کا ہندوستانی مسلم معاشرے کے مخصوص تناظر میں جیکب ہولی اوک کے رسالے 'ندائے عقل'، جو لندن سے ۱۸۴۰ء میں نکلا تھا، سے موازنہ کرنا اور مطابقت کی جستجو کرنا غلط نہیں علامہ نیاز، جیکب ہولی اوک کی طرح ساری عمر تعقل پسندی اور خرد افروزی کا پرچار کرتے رہے اور اپنی تحریروں سے ظلمت پرستی (OBSCURANTISM) کی نفی کرتے رہے۔

علامہ نیاز کے نظامِ فکر کی تفہیم کے لیے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اُن کی تین تصانیف کو میرے نزدیک کلیدی اہمیت حاصل ہے یعنی 'مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ'، 'نگار' کا 'خدا نمبر' اور 'من و یزداں'۔ ان تینوں تصانیف میں علامہ نے اُن بنیادی مسئلوں اور سوالوں سے بحث کی ہے جو ذہنِ انسانی میں ابتدائے آفرینش سے آج تک گردش

کرتے رہے ہیں اور اُن پر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے میں علامہ نے کسی مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا ہے۔

''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ'' کا پہلا باب 'تاریخ مذہب' ہے۔ اس باب اولیں کے ابتدائیے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اُن مندرجات کی روشنی میں علامہ کے نظامِ فکر کی تفہیم میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ ملاحظہ ہو:

''طبقات الارض و فلکیات کے ماہرین کا قول ہے کہ دنیا کروڑوں برس کی عمر رکھتی ہے، یعنی اس کی موجودہ حالت کروڑوں برس کے تاریخی ارتقا اور تغیر و تبدل کے بعد قائم ہوئی ہے۔ ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کا وجود روئے زمین پر کب سے پایا جاتا ہے لیکن بعض ماہرینِ علم الاقوام کا خیال ہے کہ کم از کم پچاس لاکھ سال ہوئے جب اول اول انسان کا ظہور ہوا اور غالباً اُسی وقت سے مذہب کا وجود پایا جاتا ہے۔ ہر چند انسان نے اپنے خیالات و تجربات کو تحریر میں لانا صرف پانچ ہزار سال سے شروع کیا ہے اور قدیم زمانے کی جو روایات اُس نے قلم بند کی ہیں، وہ خرافات کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں لیکن اُن کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام و مِل کی رفتار میدانِ ارتقا میں یکساں نہیں رہی اور ماحول کا اثر اُس پر برابر پڑتا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قومیں مدارجِ ارتقا طے کر کے جلد معراجِ ترقی تک پہنچ گئیں اور بعض قومیں ابھی تک ظلمت و تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بہرحال ہمیں اقوامِ عالم کی تاریخ کا علم ہو یا نہ ہو لیکن فطرتِ انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا اور ہمیشہ اُس کے ساتھ رہے گا لیکن زمانہ و ماحول کے لحاظ سے جو اثر اُس پر ہوتا ہے، اُس کے لحاظ سے اُس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی''۔

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ علامہ نیاز فتح پوری تخلیقِ کائنات و انسان کے سلسلے میں سائنسی تحقیق کو درست جانتے تھے اور چارلس ڈارون کے قانونِ ارتقا کی صحت کے قائل تھے جو بعد کی تمام سائنسی دریافتوں اور ایجادات کی کلید ثابت ہوئی۔ بالفاظِ دیگر علامہ نے مختلف مذاہبِ عالم اور الہامی کتابوں میں پائے جانے والے تخلیقِ کائنات و انسان کے نظریات کی صحت و عدمِ صحت کے باب میں رائے قائم کرنے میں ہماری غیر مبہم رہنمائی کی ہے۔ مذہب کے تاریخی کردار کے بارے میں اُن کے نظریات بھی غیر مبہم ہیں۔ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ'' کی ابتدائی سطور بعنوان 'عرضِ حال' قابلِ توجہ بھی ہیں اور تذکرہ طلب بھی:

''تاریخِ تمدنِ انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوعِ آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے اور عقائدِ مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے، اس لیے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے، کیا اُس کے اصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم و ماغی نشو و نما اور ذہنی ارتقا کا ساتھ دینے سے عاری ہے۔ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یقیناً مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہے اور اُسے ہونا بھی چاہیے، کیونکہ مذاہب عالم کی پیداوار نتیجہ تھی صرف مقامی و نسلی اقتضا کا اور اُس کے ذہن میں تمام نوعِ انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آ ہی نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی مذہب ایشیا کے مغرب میں پیدا ہوا تو اُسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اُس کی نشو و نما ہوئی تو وہ اہلِ مغرب کی طرف سے خالی الذہن تھا''۔

مذکورہ اقتباس کے مندرجات کی سچائی اور معنویت کی تفہیم کے لیے تاریخ کے صفحات اور ادوار میں بھٹکنے کے بجائے ہم اپنی ہم عصر سماجی زندگی پر نگاہ دوڑائیں تو وہ سب کچھ منکشف ہو جائے گا جو علامہ کی تحریر میں واضح بھی ہے اور بین السطور میں جامعیت کے ساتھ پنہاں بھی آج مسلم معاشرے کو جن CHALLENGES کا سامنا ہے، اُن سے ہم سب واقف ہیں۔ معاشرے کو TALIBANIZATION کا سامنا تھا اور ہے۔ ''طالبان'' اور ''القاعدہ'' کو تاریخ کے سفر میں ترقی اور پس ماندگی کی قوتوں کے درمیان ہزاروں سال سے پائی جانے والی آویزش کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تاریخِ عالم میں عہدِ تاریک (DAR KAGE) جس کا تعلق یورپ سے ہے، وہ تقریباً ہزار سال پر محیط ہے۔ یہ عہد دراصل معاشرے پر مذہب کے غلبے کا عہد ہے، یورپ پر چرچ کی حکمرانی کا عہد ہے۔ مذہب کے غلبے کے نتیجے میں سماج بانجھ پن کا شکار ہوا۔ قدیم یونان کے فکر و فلسفہ کی روشنی کو اس مذہبی غلبے کی تاریکی نے ایک ہزار سال تک گہرے رکھا اور اس طرح شعورِ انسانی کا ارتقائی سفر سکوت و جمود سے دوچار رہا۔ یہ سکوت و جمود پندرھویں صدی میں یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کے آغاز سے ٹوٹنا شروع ہوا۔ چرچ کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اور ریاست پر اُس کا کنٹرول کمزور ہوتا گیا، چرچ اور ریاست کے درمیان علاحدگی ہوتی چلی گئی۔ معاشرے اور ریاست میں مذہبی

تسلط سے آزاد ہو کر تین صدیوں کے دورانیے میں ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی ترقی تاریخ کا حصہ بنی۔ یورپ میں مذہب یعنی چرچ نے اپنے دورِ اقتدار میں سائنسی دریافتوں اور ایجادات کی راہیں مسدود کرنے کے لیے سائنس دانوں کو جلانے اور قید و بند کی صعوبتوں سے لے کر موت کے گھاٹ اتارنے کے انسانیت سوز کارنامے انجام دیے اور اندھے عقائد اور توہمات کے قلعوں کو تحفظ دینے کے لیے تاریخ کے دھارے کو روکنے کی سعیِ ناکام کی اور شکستِ دائمی چرچ کا مقدر ٹھہری اور مذہب گرجا گھروں میں محصور ہو گیا اور اُس کا دائرۂ عمل RITUALS تک محدود ہو گیا ہے۔ مسیحی چرچ نے سائنسی تحقیق و دریافت اور ایجادات کے سامنے سپر ڈال کر اپنے کو مکمل نابود ہو جانے سے بچا لیا۔ یورپی معاشرے میں چرچ کی بے چارگی کا یہ عالم ہے کہ جو چرچ سکوتِ زمین اور حرکتِ افلاک کے خلاف دریافت کرنے والوں کو سزائے موت دے کر کے اپنے اقتدار کو طول دینے کا مجاز تھا، اُس یورپ میں BERTRAND RUSSEL نے 'WHY I AM NOT A CHRISTIAN' نام کی کتاب لکھی اور بائبل کو PACK OF LIES کہا اور چرچ کو اس باب میں جنبشِ لب کی بھی جسارت نہ ہوئی اور برٹرنڈ رسل کی عظمت و شہرت میں کمی ہونے کے بجائے اُسے مزید رفعتیں اور بلندیاں میسر آئیں۔ علامہ نیاز فتح پوری کا مذہب کے حوالے سے اظہار اور اُن کی رائے ٹھوس تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔ اُنھوں نے مفروضات اور منقولات کو کہیں بھی اپنے نظامِ فکر میں جگہ نہیں دی اور مسلمہ عقائد کو بھی خود پر مسلط نہیں ہونے دیا مذہب عالم پر جس قدر گہرائی سے اُنھوں نے مطالعہ کیا تھا، شاید ہی یہ CREDIT کسی اور کو حاصل ہو۔ مذہب کے موضوعات پر سوچنا اور اظہارِ خیال کرنا خاص طور پر برِصغیر پاک و ہند کے مسلم معاشرے میں جن خطرات کو دعوت دینا تھا، اُن سے کون ناواقف ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ نے مذہب کے حوالے سے جن حتمی آرا کا اظہار جگہ جگہ کیا ہے، حفظِ ماتقدم کے طور پر مذاہبِ ابراہیمی میں مسیحیت تک محدود رکھا ہے اور اُس سے آگے بڑھنے سے شعوری طور پر گریزاں رہے۔ مذہب کے مستقبل کے بارے میں اُن کا کہنا تھا:

> "مذہب کی ابتدا دنیا میں کیونکر ہوئی اور عہدِ حاضر میں اس کے ضعف و اضمحلال کے کیا اسباب ہیں، اس پر قیاس کر کے مستقبل کے لیے آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب، جو عملی طور پر اب بھی تقریباً فنا ہو چکا ہے، اقتصادی و ذہنی اعتبار سے بالکل محو ہو جائے گا اور ایک زمانہ آنے والا ہے جب مذہب کی تعلیمات و اعتقادات کو اُس نگاہ سے دیکھا جائے گا جس طرح آج سکونِ زمین و حرکتِ افلاک کے نظریہ قدیم کو دیکھا جاتا ہے یا جس طرح ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ پرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے"۔

کیونکہ بقول اُن کے دنیا کا ہر وہ قدم جو علم و حکمت کی طرف بڑھتا ہے، مذہب کو سو قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ مذہب کے فنا ہو جانے کی بات میرے نزدیک محلِ نظر ہے، بلکہ علامہ کا یہ کہنا مجھے زیادہ صائب نظر آتا ہے کہ "مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا اور ہمیشہ اُسی کے ساتھ رہے گا لیکن زمانہ و ماحول کے لحاظ سے جو اثر اُس پر ہوتا ہے، اُس کے لحاظ سے اُس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی"۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں مسیحی چرچ نے نشاۃِ ثانیہ کے بطن سے پیدا ہونے والی تحریکِ اصلاح اور صنعتی انقلاب کے تقاضوں اور جبرِ حالات کے پیشِ نظر سماج کے ارتقائی سفر میں حائل ہونے کے بجائے اپنے کو محدود سے محدود تر دائرے میں محصور کر لیا ہے اور اس طرح تاریخ کے پہیے تلے پس جانے سے خود کو بچا لیا ہے۔

مسلم معاشرے میں بھی نشاۃِ ثانیہ کی تحریک جاری و ساری ہے۔ برِصغیر پاک و ہند میں نشاۃِ ثانیہ کی تحریک کا آغاز سرسید احمد خان کی ۱۸۶۴ء کی سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے ہوا ہے بعد ازاں علی گڑھ تحریک نے ایک ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کی۔ تعقل پسندی اور خرد افروزی اس تحریک کی اساس ہے۔ جدید علوم و فنون تک رسائی کے سلسلے میں اس تحریک نے ہندوستان کی مسلم آبادی کی رہ نمائی نہ کی ہوتی تو برِصغیر کے مسلمان بھی افغانیوں کی طرح طالبان کی ظلمت پرستی کے غاروں کے مکین ہوتے۔ علی گڑھ تحریک کو آغازِ سفر سے زبردست مخالفتوں کا سامنا ہوا، سرسید احمد خان کو کفر و الحاد کے فتووں سے نوازا گیا۔ دیوبند اور ندوۃ العلما کے مدرسے علی گڑھ تحریک کی راہ میں بند باندھنے کے لیے قائم ہوئے۔ تاریخ نے سرسید کا ساتھ دیا اور نشاۃِ ثانیہ کی تحریک کی پیش رفت جاری ہے، ہر چند کہ رجعت پرستی کی طاقتیں آج بھی سرنگوں اور سپر انداز ہونے کو تیار نہیں ہیں اور شدت پسندی، مذہبی جنون اور دہشت گردی کو جہادی کلچر قرار دے کر مسلم معاشرے کو دنیا کی نظر میں بے توقیر کرنے کے درپے ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری کو میں اس نشاۃِ ثانیہ کی تحریک کا ایک اہم رکن سمجھتا ہوں اور اُن کے کارہائے نمایاں کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی زاویۂ نظر سے لگاتا ہوں سرسید احمد خان اور اُن کے رفقا نے تعقل پسندی اور خرد افروزی کی جو شمعیں جلائی تھیں، علامہ نیاز فتح پوری نے اپنی تحریروں سے اُس کی روشنی کو دوچند کیا۔

پندرھویں صدی میں شروع ہونے والی یورپ کی نشاۃِ ثانیہ یعنی احیائے فکر و دانش کی تحریک قدیم یونانی فکر و دانش کے احیا کی تحریک تھی اور اس باب میں یونانی فکر و فلسفہ کی ترسیل اُن مسلم مفکروں اور فلسفیوں کے وسیلے سے یورپ کو ہوئی تھی جنھوں نے قدیم یونانی خزینے کو عربی زبان میں منتقل کر کے انسانی تہذیب و تمدن کے گراں مایہ اثاثے کو محفوظ کر لیا تھا۔ اُن عظیم مسلم مفکروں اور فلسفیوں میں حکیم ابوبکر رازی (۸۶۵ء۔۹۲۵ء)، ابنِ رشد (۱۱۲۶ء۔۱۱۹۸ء)

،الفارابی (۸۷۰ء۔۹۵۰ء)،البیرونی (۹۷۳ء۔۱۰۴۸ء)، حکیم ابن سینا (۹۸۰ء۔ ۱۰۳۷ء) ، عمر خیام (۱۰۴۸ء۔۱۱۳۱ء)،ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۳۹۵ء)،جابر بن حیان (۷۲۱ء۔۸۱۵ء) الخوارزمی (۷۸۰ء۔۸۵۰ء)، المسعودی (وفات:۹۵۷ء)،ابن الہیثم (۹۶۵ء۔۱۰۴۰ء) اور النفیس (۱۲۱۳ء۔۱۲۸۸ء) کے اسمائے گرامی اور اُن کے کارنامے سرفہرست ہیں۔ مسلم معاشرے کی یہ پونجی یورپ تک پہنچ کر نشاۃ ثانیہ کی اساس بنی اور آج سائنسی معجزوں کی جو کہکشاں سجی ہے وہ اُسی کی عطا ہے۔ مسلم فکر و دانش کی جو کہکشاں خلافتِ عباسیہ کے عہد میں سجی تھی ، وہ بعد کے ارباب اقتدار کے ہاتھوں ایسی بجھی کہ گزشتہ چھ صدیوں سے مسلم معاشرے میں کہیں کسی سائنسی تحقیق کی روایت کی تلاش نہیں کی جا سکتی اور مسلم معاشرہ فکر و دانش کے شعبے میں گزشتہ چھ صدیوں سے اس طرح بانجھ پن میں مبتلا ہے جس طرح یورپ مسیحی چرچ کے زیرِ تسلط ایک ہزار برس تک عہدِ تاریک میں گم رہا۔ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کو اپنے سفر کے ابتدائی ادوار میں جن کٹھنائیوں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا، میرا خیال ہے کہ اُن مرحلوں سے مسلم معاشرے میں گزشتہ ڈیڑھ صدی سے برپا نشاۃِ ثانیہ کو بھی گزرنا پڑے گا۔ کامیابی کی منزل ہماری نشاۃِ ثانیہ کا مقدر ہے مگر راہ میں "طالبان" اور "القاعدہ" کے جو اندھیرے حائل ہیں انھیں دور کرنے کی ہمہ جہت کوششیں ہمارے اندر سے ہونی چاہییں۔

مسلم معاشرے کو جس فکری انقلاب کی ضرورت ہے، اُس کی رونمائی ہمیں جن اہلِ دانش اور اربابِ فکر و نظر سے حاصل ہو سکتی ہے ، اُن میں علامہ نیاز فتح پوری کی حیثیت مشعلِ راہ کی ہے۔ TALIBANIZATION کا وقتی خطرہ جو چند برس پہلے مغرب کی فوجی مداخلت سے ٹل گیا تھا، آج بھی ایک بڑے خطرے کی صورت میں جدید تہذیب و تمدن کے لیے بڑا THREAT اور CHALLENGE بنا ہوا ہے اور پاکستان میں آئے دن ہونے والے خودکش حملے اُس کے مظاہر ہیں۔ اسکولوں کی عمارتوں کو آئے دن منہدم کیا جانا جن کی تعداد اب سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی ہو گئی ہے، اس کے مکمل سدِ باب کے لیے خود ہمیں اپنے معاشرے کو انقلاب سے دوچار کرنا پڑے گا اور جہل اور ظلمت پرستی پر مبنی نظریات اور افکار کی بیخ کنی فکر و دانش کے آفتابِ تازہ کی کرنوں سے ممکن ہو سکے گی۔ اس ضمن میں بھی علامہ نے ہماری رہ نمائی کی ہے اور دعوتِ فکر دی ہے۔ "مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ" میں 'عرضِ حال' کے زیرِ عنوان اُنھوں نے فرمایا تھا:

> "دنیا میں اور بہت سے ملک ہیں لیکن اس باب میں پاکستان سے بدبخت کوئی نہیں اور مذہب اور مذہبیت کا استعمال جس بری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے، اس کی مثال اس وقت کہیں نہیں مل سکتی۔ ایک مولوی کی تمام تعلیمات و مقتضیاتِ مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبیعیات کی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوف ناک و تاریک مناظر سے ذرا ذرا کر وہ اپنی پرستش کراتا ہے۔ اُس کو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے ،زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، جہل و تاریکی کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے"۔

علامہ نیاز نے ان خیالات کا اظہار تقریباً پانچ عشرے قبل کیا تھا۔ گزشتہ پانچ دہائیوں میں انسان نے جو مراحلِ ترقی طے کیے ہیں، انھیں ہزاروں سالوں کی ترقی پر سبقت حاصل ہے۔ انسان کے نقوشِ قدم چاند پر ثبت ہوئے ،خلاؤں کی تسخیر کے باب میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی ہے کرۂ ارض ذرائع ابلاغ کے حوالے سے ایک GLOBAL VILLAGE بن چکا ہے اور سائنسی معجزوں نے روئے زمین کو ایک حیرت کدے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ بڑی حقیقتیں بے چارے مولوی کے فہم و ادراک میں کیونکر جگہ پا سکتی ہیں، کیونکہ اُس کے نزدیک سائنس اپنی طینت کے اعتبار سے کفر والحاد کا سرچشمہ ہے۔ وہ تو العلم حجاب الاکبر کا قائل ہے۔ جس مولوی کے سماجی کردار پر علامہ نے ضرب کاری لگائی ہے، اُسے علامہ اقبال نے "ملا" کی اصطلاح کے حوالے سے اُس کے منفی کردار کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ "مولوی" اور "مُلا" کی اصطلاحات کی تفہیم آج کے تناظر میں "طالبان" اور "القاعدہ" کے حوالے سے بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ افغانستان میں طالبان نے اپنے چار سالہ دورِ اقتدار میں جہل پسندی، ظلمت پرستی، تہذیب و تمدن دشمنی اور ثقافت کی بیخ کنی کی جو مثالیں قائم کیں، وہ خود محیر العقول ہیں۔ یہ جنگ جو افغانستان میں لڑی گئی، میرے نزدیک SCIENCE VERSUS SUPERSTITIONS کی جنگ تھی۔ اُن کا جذبۂ جہاد میرے نزدیک جذبۂ خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔ اس جذبے سے سرشار طالبان اور القاعدہ کے مجاہدوں کو اپنا ہم مقابل نظر ہی نہیں آیا۔ وہ یکے بعد دیگرے شہروں کو خالی کرتے گئے، بغیر لڑے ہوئے پسپا ہوتے رہے اور آخر کار اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے۔ اُن بے چاروں کو آج کی جنگی حکمتِ عملی اور آلاتِ جنگ کی موثر کارگزاریوں اور اہداف کا ادراک بھی نہیں ہو سکا۔ اُن کے ہاتھوں میں جو مستعار اسلحے تھے، وہ خود سائنس اور ٹکنالوجی کی پیداوار تھے جن کے SPARE PARTS بنانے کی EXPERTISE بھی اُن کے پاس نہیں۔ اُن کی اپنی اہلیت شمشیر و سناں بنانے تک محدود ہے۔ وہ ریڈیو ٹیلیویژن اور تعلیمی اداروں کو بند کر کے افغان معاشرے کو STONE AGE میں لے جانے کی اہلیت ضرور رکھتے تھے، مگر وہ آج کی دنیا کو اِسی سمت کے سفر پر گامزن نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی اِس سادگی اور سادہ لوحی پر نوحہ و ماتم کرنے کے سوا اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔

ایک مکتبہ فکر جو "طالبان" اور "القاعدہ" کے نظریات کا علم بردار اور جہادی کلچر کا حامی ہے، وہ آج کی آویزش کو اسلام اور مغرب کے درمیان معرکہ آرائی قرار دے کر مسلم دنیا کے عوام کو گم راہی کے اندھیروں میں گھرا ہوا دیکھنے کا خواہاں ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری جس نشاۃِ

باقی صفحہ نمبر 16 پر

ثانیہ کے رکن رکین تھے، اُس کو آج طالبان اور القاعدہ جیسی تنظیموں اور تحریکوں کے CHALLENGES کا سامنا ہے۔ یہ تحریکیں اور تنظیمیں مختلف ناموں سے مسلم دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔ مسلم معاشرے کو اگر ان کے منفی اثرات سے نہیں بچایا گیا تو یہ تاریخی سانحے اور المیے پر منتج ہوں گی۔ انسان کا حال اور مستقبل سائنس اور ٹکنالوجی سے وابستہ ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی پیش رفت اور اُس کی فتوحات کا سفر وقت کے ساتھ تیز تر ہوتا جائے گا اور جو بھی اس سفر کی راہ میں حائل ہوگا، معدوم ہو جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی طرح مسلم معاشرے میں جاری و ساری نشاۃ ثانیہ کی تحریک کامران و کامیاب ہوگی جس کے محرک سرسید احمد خان اور جس کی نظریاتی اساس کو علامہ نیاز نے اپنی سیکولر فکر و دانش اور علم و ادراک سے مستحکم تر کرنے کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ وہ قرونِ اولیٰ کے اُن چند مسلم مفکروں اور دانش وروں کے قبیلے کے رکن کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے جن کے حوالے سے علم و دانش کی روایت تاریخ کا حصہ ہے اور بیسویں صدی میں روشن خیالی، خرد افروزی اور تعقل پسندی کے کارواں سالاروں میں بھی شمار کیے جائیں گے اور ہمیشہ بصد احترام یاد رکھے جائیں گے۔